ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو غصّہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے۔''

تشریح: یعنی لوگوں کو دین کی تعلیم دو اور انھیں دین کے تقاضوں سے باخبر کرو لیکن یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہے کہ دینِ حق کا اصل مقصود لوگوں کو مشکلات اور دشواریوں میں مبتلا کرنا ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ تو انھیں دشواریوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے آیا ہے (الاعراف: ۱۵۷) اس لیے حکمتِ تعلیم و دعوت یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے دین کی تعلیمات اس طرح پیش کی جائیں کہ وہ ان کو باعثِ زحمت و مصیبت نہیں بلکہ وہ ان کو اپنے لیے باعث رحمت تصوّر کریں۔ دین انھیں ایک ناخوش گوار بوجھ اور ایک دشوار گزار گھاٹی محسوس نہ ہو جسے عبور کرنا انھیں مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آئے۔

غصّہ آنے پر خاموشی اختیار کرنا غصہ پر قابو پانے کی یہ ایک بہترین عملی تدبیر ہے۔ اسی لیے آپؐ نے تین دفعہ یہ بات فرمائی کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے۔ غصّہ کی حالت میں آدمی زبان کھولے گا تو اس کا پورا امکان ہے کہ وہ اپنے غصّہ پر قابو نہ پاسکے۔ کیوں کہ جب وہ ردِعمل میں کچھ کہے گا تو دوسرا فریق بھی چپ نہیں رہ سکتا، وہ بھی کچھ نہ کچھ کہے گا۔ اس سے غصّہ مزید بھڑکے گا اور بات کشت وخوں ریزی تک پہنچ سکتی ہے۔ اور پھر آپس کے تعلقات کی درستی کے امکانات بہت ہی کم باقی رہ سکیں گے۔

صبر

(۱) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ٱلْخُدْرِیِّؓ اَنَّ نَاسًا مِّنَ الْاَنْصَارِ سَأَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوْهُ فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوْهُ فَأَعْطَاهُمْ حَتّٰى نَفِدَ مَا عِنْدَهُ فَقَالَ: مَا يَكُوْنُ عِنْدِیْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ اَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ، وَ مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَ مَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ، وَ مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا اُعْطِیَ اَحَدٌ عَطَآءً خَيْرًا وَّ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، انھوں نے پھر طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، انھوں نے پھر طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، یہاں تک کہ جو کچھ آپؐ کے پاس تھا ختم ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''میرے پاس جو مال بھی ہوگا میں تم سے بچا کر اسے نہیں رکھوں گا اور جو کوئی سوال سے بچنا چاہتا ہے خدا اسے مانگنے (کی ذلت) سے بچا دیتا ہے اور جو کوئی استغناء چاہتا ہے خدا اسے مستغنی کر دیتا ہے اور جو شخص صبر اختیار کرنا چاہتا ہے خدا اسے صبر دے دیتا ہے۔ اور کسی کو کوئی عطا صبر سے بہتر اور زیادہ وسیع نہیں بخشی گئی۔''

تشریح: نبی (ﷺ) نہایت فیاض تھے۔ اسی لیے فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے کچھ بھی اٹھا کر نہیں رکھ سکتا۔ مانگو گے تو تمھیں محروم نہیں لوٹاؤں گا۔ لیکن اسی کے ساتھ آپؐ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ آپؐ کے رفقاء اخلاقی محاسن کے پیکر ہوں۔ ان کے اندر اخلاق و کردار کے لحاظ سے کوئی نقص باقی نہ رہے۔ ان کی تربیت کے پیشِ نظر یہاں جو تعلیم آپؐ نے انھیں دی وہ اس وقت جب کہ آپؐ کا ہاتھ خالی تھا۔ انھیں دینے کو آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا، تاکہ کسی کے دل میں شیطان یہ وسوسہ نہ ڈال سکے کہ یہ صبر و استغناء کی تعلیم نہ دینے کا ایک بہانہ ہے۔

عفت، استغناء اور صبر بہترین اخلاقی اوصاف ہیں لیکن یہ اوصاف آدمی میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کو ان کی قدر و قیمت کا صحیح احساس ہو اور وہ ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہو اور اسے خدا پر کامل بھروسہ ہو کہ وہ بندے کا اصل کفیل ہے اور اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ کسی کو دوسروں سے بے نیاز اور ان اعلیٰ اوصاف سے آراستہ کر دے۔

یہ فقرہ کہ صبر سے بہتر اور وسیع تر شے کسی کو عطا نہیں ہوئی، نہایت جامع فقرہ ہے۔ جس کسی کو صبر کی دولت ملی تو سمجھ لو کہ وہ سب سے بہتر شے کا مالک ہوگیا جو تمام بھلائیوں اور محاسن و محامد کو اپنے میں سمیٹ لینے والی ہے۔ اگر کسی کو صبر کی طاقت حاصل ہوگئی تو پھر دوسرے محاسن کا حصول اس کے لیے دشوار نہیں رہا۔ وہ زندگی کے اصل مزاج سے آشنا ہوگیا۔ صبر کے بغیر زندگی کی اعلیٰ قدریں کبھی ہاتھ نہیں آتیں۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ (حٰمٓ السجدہ: ۳۵) ''اور یہ چیز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور یہ صرف اسے حاصل ہوتی ہے جو بڑا نصیبے والا ہوتا ہے۔'' صبر کے بغیر کسی اعلیٰ تہذیب کا تصوّر نہیں

کیا جا سکتا۔ اعلیٰ زندگی میں صبر دیگر خوبیوں کے ساتھ ایک جمالیاتی احساس بن کر ابھرتا ہے جس پر کسی دوسری چیز کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ صبر سے ہر طرح کی تنگی رفع ہو جاتی ہے۔ اس سے ذہن و فکر اور سعی و عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ صبر اپنا مددگار خود ہوتا ہے۔ مادّی ضروریات کو ہرگز اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ اخلاقی اقدار کا احساس ہی باقی نہ رہے۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ مَالِکِ اِلْاَشْعَرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: الطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوۃُ نُوْرٌ وَّالصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ وَّالصَّبْرُ ضِیَآءٌ وَّالْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْا فَبَایِعٌ نَّفْسَہٗ فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''طہارت آدھا ایمان ہے۔ اور الحمدللہ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ والحمدللہ جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے اس کو بھر دیتے ہیں۔ نماز نور ہے صدقہ دلیل و برہان ہے، صبر روشنی ہے اور قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف حجت ہے ہر شخص صبح اٹھتا ہے پھر اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، پھر یا تو اسے آزاد کرتا ہے یا اسے تباہ و ہلاک کرتا ہے۔''

تشریح: ایمان اس کا متقاضی ہے کہ ہمارا ظاہر اور ہمارا باطن دونوں پاک ہوں۔ جس کسی نے اپنے جسم و لباس اور اپنے مکان وغیرہ کو صاف ستھرا رکھا اس نے ایمان کے نصف تقاضے پورے کر لیے۔ اسی لیے فرمایا کہ طہارت آدھا ایمان ہے۔ اب صرف یہ باقی رہتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر کی طرح اپنے باطن یعنی اپنے افکار و جذبات اور اپنے اخلاق و کردار کے اندر بھی پاکیزگی لائے تاکہ ایمان کے جملہ تقاضے پورے ہو سکیں۔

انسان کا اصل سرمایۂ تسکین و حیات عرفانِ حق ہے جس کا اظہار سبحان اللہ والحمدللہ جیسے کلماتِ مقدسہ کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔ یہ کلمات جن حقیقتوں کے ترجمان ہیں ان ہی حقیقتوں کے اثبات و اعتراف سے کائنات میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ان ہی کی وجہ سے کائنات کی تمام چیزیں آیاتِ الٰہی قرار پاتی ہیں۔

نماز نور ہے۔ جس کی زندگی میں نماز نہ ہو اس کی زندگی بے نور ہو گی۔ اس کی زندگی میں

تاریکی ہی تاریکی ہوگی خواہ اسے اس کی خبر نہ ہو۔ نماز ہی سے آدمی کی اصل حیثیت کا اظہار ہوتا ہے اور اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی حیثیت اور مقام کو پہچان لیا ہے۔ یہ مقام اتنا بلند و برتر ہے کہ اس سے محروم ہونا کسی کو بھی گوارا نہیں ہوسکتا۔ برا ہو جہل و بے حسی کا جو لوگوں کو محروم ہی نہیں رکھتی بلکہ ان سے زیاں کا احساس بھی چھین لیتی ہے۔ تاریکی درحقیقت محرومی اور موت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس روشنی کام یابی اور زندگی کا مظہر ہے۔ ہماری نماز اگر صحیح معنی میں نماز ہو تو ہماری زندگی کی راہ کبھی تاریک نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہم کبھی اپنی منزل سے ناآشنا ہوسکتے ہیں۔ نماز کے بغیر ہمارا سفر بے منزل اور ہماری راہ تاریک سے تاریک تر ہوکر رہ جاتی ہے۔

زندگی ہمیشہ فیاضی کی متقاضی ہوتی ہے کیوں کہ خدا کی فیاضی نے اسے وجود بخشا ہے۔ بخل موت ہے، کسی چیز کی توقع اور امید زندہ شخص سے کی جاسکتی ہے مردہ سے نہیں۔ صدقہ سے جہاں کسی کی زندگی کا پتہ چلتا ہے وہیں صدقہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ بندہ اپنے خدا کا مقرب اور اس کی مغفرت اور نجات کا مستحق ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ساری سرفرازیاں اور کام یابیاں ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جو انفاق اور صدقہ کے ذریعہ سے اپنے صادق اور سچے ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

صدقہ کا تعلق محض مال سے نہیں ہے۔ صدقہ حقیقت کے اعتبار سے ایک کردار ہے۔ مومن بھلائی کے جو کام بھی کرتا ہے وہ سب صدقہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ وہ شخص تاریکی اور اندھیرے ہی میں بھٹک رہا ہے جس کی زندگی صبر کی صفت سے ناآشنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حیات باکردار کا نمایاں وصف صبر ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

آدمی اگر قرآن کے حقوق کو پہچانتا اور ان کو ادا کرتا ہے تو قرآن اس کی کام یابی اور فلاح کا ضامن اور اس کی نجات کی دلیل ہے۔ لیکن کوئی شخص اگر قرآن کے حقوق کا پاس ولحاظ نہیں رکھتا بلکہ ان حقوق کو بے دردی سے پامال کرتا ہے۔ وہ نہ خود قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اور نہ دوسروں کو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے تو یہی قرآن اس کے مجرم ہونے کی سب سے بڑی شہادت قرار پاتا ہے۔

حدیث کے آخری حصے میں اس صورتِ حال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے جس صورتِ حال سے دنیا میں ہم دو چار ہیں۔ ہمارا ہر روز ہمارے لیے یوم العمل اور یوم الجزاء دونوں بن کر آتا ہے۔ ہر روز ہم خدا کی سب سے بڑی عطا یعنی زندگی کے ساتھ لازماً دو میں سے کوئی ایک طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ایک طرزِ عمل تو وہ ہے جسے اختیار کر کے ہم خود کو تباہی سے بچا لیتے ہیں اور دوسرا طرزِ عمل وہ ہے جو حقیقت میں زندگی کے ساتھ ایک طرح کی بدسلوکی ہے۔ اسے اختیار کرنے کے بعد زندگی اعلیٰ مفہوم سے عاری ہو جاتی ہے اور ہم اس کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں۔ گو بہ ظاہر ہم اس کے بعد بھی جی رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ہم ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ دنیا میں جب تک ہم ہوتے ہیں تلافیِ مافات کی گنجائش باقی رہتی ہے لیکن عمر تمام ہونے کے ساتھ تلافی کی مہلت بھی تمام ہو جاتی ہے۔

یہ حدیث متنبہ کرتی ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا مطلب محض زندگی بسر کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طرح سے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہوتا ہے... اس میں کامیابی یا ناکامی کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ہم زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔ ہماری زندگی خدا کی اطاعت و بندگی میں گزرتی ہے یا اس کی نافرمانی اور مخالفت میں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا ہر دن خدا کی رضا طلبی میں بسر ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ہر روز درحقیقت اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی تنگی و سختی اور گرفت سے آزادی حاصل کر لی اور وہ ہر قسم کی ہلاکتوں سے نجات پا گئے۔

صبر مصائب میں

〈۱〉 عَنْ صُهَيْبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَّ لَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”مومن کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا تو ہر معاملہ اس کے حق میں سراپا خیر ہوتا ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے

اور اگر اسے کوئی تکلیف و مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے سرتاسر خیر ہوتا ہے۔"

تشریح: آدمی کی زندگی دو حال سے خالی نہیں ہوتی۔ یا تو اسے آرام اور عیش حاصل ہوگا یا اسے کسی تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ ان میں سے جو حالت بھی پیش آئے مومن اس سے خیر ہی سمیٹتا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف مومن ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ غیر مومن شخص نہ خوشیوں اور آرام و راحت سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ رنج و مصیبت سے۔ اسے اگر آرام و راحت کی زندگی میسر ہوتی ہے تو وہ متکبر بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں سرکشی اور ناسپاسی کے سوا آپ کچھ نہیں دیکھیں گے۔ اور اگر کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ بے قرار ہو کر جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ پھر ایک بندۂ شاکی کے سوا آپ اسے کچھ نہیں پائیں گے۔

لیکن مومن کا طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ خوشی اور راحت میں وہ اپنے خدا کا شکر گزار ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کا دامن تھام لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی بھلائی ہوگی۔ وہ اپنے رب کے فیصلے پر راضی ہوتا ہے۔ یہ شکر و صبر درحقیقت زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں ہیں جن کے بغیر ہم کسی اعلیٰ کردار کا تصوّر نہیں کر سکتے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ يُصَابُ فِیْ وَلَدِهٖ وَ حَامَّتِهٖ حَتّٰی يَلْقَی اللّٰهَ وَ لَيْسَتْ لَهٗ خَطِيْئَةٌ۔ (مؤطا امام مالک)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مومن کو اپنی اولاد اور اپنے اعزّہ کے سلسلے میں رنج و مصیبت پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے اس حالت میں ملتا ہے کہ اس کا کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔"

تشریح: اولاد ہو یا اعزّہ و اقرباء، ان کے جدا ہونے کا غم فطری ہے۔ دنیا میں رنج و غم کا یہ سلسلہ زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔ دنیا میں اس غم سے مفر نہیں۔ مومن بھی اس رنج و غم سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس پر خدا کی خاطر صبر سے کام لیتے ہیں۔ یہ رنج و مصیبت جس پر اہلِ ایمان صبر کرتے ہیں خدا اسے ان کے عام گناہوں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندۂ مومن جب دنیا سے جاتا ہے تو وہ گناہوں کی آلائشوں سے بالکل پاک و صاف ہوتا ہے۔ مصائب پر صبر اختیار کرنے کا اجر و ثواب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: مَا يَزَالُ الْبَلَآءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَةِ

فِیْ نَفْسِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَ مَالِہٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰہَ تَعَالٰی وَمَا عَلَیْہِ خَطِیْئَۃٌ۔ ''مومن مردوں اور مومن عورتوں پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں۔ کبھی خود اس پر کوئی مصیبت آتی ہے، کبھی اس کی اولاد پر اور کبھی اس کے مال پر (اور وہ صبر اختیار کرتا ہے جس سے اس کا قلب صاف ہوتا رہتا ہے اور برائیاں اس سے دور ہوتی رہتی ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔''

〈۳〉 وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَہٗ فَاِنْ کَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْیَقُلِ اللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَ تَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس تکلیف وضرر کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہو موت کی تمنا نہ کرے۔ اور اگر یہ تمنا کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو تو اسے یہ کہنا چاہیے: اے اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور مجھے موت دے اس وقت جب کہ مرنا میرے لیے بہتر ہو۔''

تشریح: ضرر مالی بھی ہوسکتا ہے اور جسمانی بھی۔ موت کی تمنا کرنا کسی حال میں صحیح نہیں ہے۔ کسی کو اگر کوئی ضرر پہنچا ہے تو اس کا اجر وثواب بھی غیر معمولی ہے۔ پھر بھی اگر ناگزیر ہو تو دعا کا وہ انداز اختیار کرنا چاہیے جس کی تعلیم اس حدیث میں دی گئی ہے۔ خدا سے موت طلب کرنا تو درست نہیں ہے لیکن خدا کے راستے میں شہید ہونے کی آرزو مستحب ہے۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: یَقُوْلُ اللّٰہُ مَا لِعَبْدِی الْمُؤْمِنِ عِنْدِیْ جَزَآءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِیَّہٗ مِنْ اَھْلِ الدُّنْیَا ثُمَّ احْتَسَبَہٗ اِلَّا الْجَنَّۃَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے: ''میرے اس مومن بندے کی میرے پاس جنت ہی جزا ہے جس کے کسی عزیز ترین فرد کو اہلِ دنیا میں سے میں اٹھالوں اور وہ اس پر میری خاطر صبر کرے۔''

〈۵〉 وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: یَقُوْلُ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَۃِ الْاُوْلٰی لَمْ اَرْضَ لَکَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّۃِ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے آدم کے بیٹے! اگر تو نے صدمہ کے شروع میں صبر کیا اور میری رضا اور اجر وثواب کو پیش نظر رکھا تو میں تیرے لیے جنت سے کم اور اس کے سوا کسی اجر وثواب پر راضی نہ ہوں گا۔''

تشریح: کسی صدمہ کا اثر درحقیقت ابتدا ہی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ دن گزر جانے پر تو طبعی طور سے غم اور صدمہ کا اثر خود بہ خود زائل ہوجاتا ہے۔ اسی لیے صدمہ کے شروع میں صبر کرنے کے اجر وثواب کا ذکر فرمایا گیا۔

صبر کی وجہ سے بندہ کا اپنے خدا سے کچھ ایسا تعلق ہوجاتا ہے کہ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے اس بندہ کو جس نے اس کی خاطر صبر کیا اپنی سب سے بڑی نعمت جنت نہ دے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِنِسْوَةٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ لَا یَمُوْتُ لِاِحْدٰکُنَّ ثَلٰثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَحْتَسِبُهٗ اِلَّا دَخَلَتِ الْجَنَّةَ فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِّنْهُنَّ اَوِ اثْنَانِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ اَوِ اثْنَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے انصار کی کچھ عورتوں سے فرمایا: ''تم میں سے جس کسی کے تین بچے مرجائیں اور وہ ثواب کو پیش نظر رکھے (صبر کرے) تو وہ لازماً جنت میں داخل ہوگی۔'' ان عورتوں میں سے ایک نے عرض کیا: یا دو۲ بچے مریں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: ''یا دو مریں (جب بھی یہی بشارت ہے)۔''

تشریح: بخاری ومسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لَهُمَا ثَلٰثَةٌ لَمْ یَبْلُغُوا الْحِنْثَ، ''تین بچے جو حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں۔'' چھوٹے بچوں سے ماں کی محبت بڑوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے مرنے کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے ماں کے بالکل تابع ہوتے ہیں۔ ان کا سارا انحصار ماں ہی پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ ان سے ماں کو انتہائی تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ مُعَاذٍؓ اَنَّهٗ مَاتَ لَهٗ اِبْنٌ فَکَتَبَ اِلَیْهِ النَّبِیُّ ﷺ اَلتَّعْزِیَةَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰی مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ سَلَامٌ عَلَیْکَ فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْکَ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعْظَمَ اللّٰهُ لَکَ الْاَجْرَ

وَاَلْهَمَكَ الصَّبْرَ وَ رَزَقْنَا وَ اِيَّاكَ الشُّكْرَ فَاِنَّ اَنْفُسَنَا وَ اَمْوَالَنَا وَ اَهْلَنَا مِنْ مَّوَاهِبِ اللّٰهِ الْهَنِيْئَةِ وَ عَوَارِيْهِ الْمُسْتَوْدَعَةِ مَتَّعَكَ اللّٰهُ بِهٖ فِيْ غِبْطَةٍ وَّ سُرُوْرٍ وَ قَبَضَهُ مِنْكَ بِاَجْرٍ كَبِيْرٍ، اَلصَّلٰوةُ وَالرَّحْمَةُ وَالْهُدٰى اِنِ احْتَسَبْتَهٗ فَاصْبِرْ وَلَا يُحْبِطُ جَزَعُكَ اَجْرَكَ فَتَنْدَمَ وَاعْلَمْ اَنَّ الْجَزَعَ لَا يَرُدُّ مَيْتًا وَّلَا يَدْفَعُ حَزَنًا وَّمَا هُوَ نَازِلٌ فَكَانَ قَدْ. وَالسَّلَامُ. (الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ان کے ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا تو رسولِ خدا ﷺ نے انھیں یہ تعزیت نامہ لکھوایا: اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی جانب سے معاذ بن جبل کے نام۔ سلامٌ علیک! میں اس خدا کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بعد ازاں، خدا تمھیں اجرِ عظیم دے اور تمھارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہمیں اور تمھیں (اپنی نعمتوں پر) شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے اموال اور ہمارے اہل وعیال سب خدا کی مبارک ومرغوب عطیات ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں۔ خدا نے اس سے عیش وسرور کے ساتھ نفع اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کا موقع عنایت فرمایا اور اسی نے اسے تم سے بڑے اجر کے صلہ میں واپس لے لیا۔ خاص نوازش، رحمت اور ہدایت (کی بشارت) ہے اگر تم نے اجر وثواب کے پیشِ نظر صبر کیا۔ پس صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ تمھاری بے تابی و بے صبری تمھارے اجر وثواب کو غارت کردے۔ پھر تمھیں ندامت ہو۔ جان رکھو کہ کوئی مرجانے والا بے صبری و بے تابی سے لوٹنے کا نہیں اور نہ اس سے رنج وغم کبھی دور ہوتا ہے۔ اور جو کچھ واقع ہونے کو ہوتا ہے حقیقت میں وہ واقع ہو چکا ہوتا ہے۔''

تشریح: فرمایا گیا کہ بچے کے انتقال پر جو گہرا صدمہ تمھیں پہنچا ہے اس پر خدا تمھیں اجرِ عظیم سے نوازے اور تمھارے دل کو صبر وسکون عطا کرے۔

ہمارے پاس جو چیزیں بھی ہیں ہم ان کے مالک نہیں ہیں۔ ان کا اصل مالک تو خدا ہی ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے ہمیں اس کا موقع عطا فرماتا ہے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان سے دل بہلائیں۔ اور جب اس کی مشیت ہوتی ہے وہ اپنی چیز واپس لے لیتا ہے لیکن واپس لینے

کے صلہ میں اس کے یہاں ہمارے لیے اجر کبیر (بڑا اجر) ہے۔ یہ اس کا انتہا درجہ کا کرم اور نوازش ہے کہ ''لیتا ہے اپنی چیز، پھر بھی مفت نہیں لیتا۔

قرآن میں ہے: اَلَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ۝ؕ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ۝ (البقرہ ۱۵۶:۱۵۷) ''جو اس وقت جب کہ ان پر کوئی مصیبت آتی ہے کہتے ہیں 'بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی خاص نوازشیں ہیں اور رحمت بھی اور یہی ہیں جو ہدایت یاب ہیں۔'' حضور اکرم (ﷺ) نے قرآن کی دی ہوئی اسی بشارت کی روشنی میں اپنے تعزیت نامہ میں یہ الفاظ لکھوائے ہیں: اَلصَّلٰوةُ وَالرَّحۡمَةُ وَالۡهُدیٰ اِنِ احۡتَسَبۡتَهٗ۔'' خاص نوازش اور رحمت اور ہدایت کی بشارت ہے اگر تم نے اجر و ثواب کے پیشِ نظر صبر کیا۔''

صبر انتقامی جذبات میں

〈۱〉 عَنۡ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ثَلٰثٌ مِّنۡ اَخۡلَاقِ الۡاِیۡمَانِ مَنۡ اِذَا غَضِبَ لَمۡ یُدۡخِلۡهُ غَضَبُهٗ فِیۡ بَاطِلٍ، وَ مَنۡ اِذَا رَضِیَ لَمۡ یُخۡرِجۡهُ رِضَاهُ مِنۡ حَقٍّ وَ مَنۡ اِذَا قَدَرَ لَمۡ یَتَعَاطَ مَا لَیۡسَ لَهٗ۔ (المعجم الصغیر للطبرانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تین باتوں کا تعلق ایمانی اخلاق سے ہے۔ جب کوئی شخص غصّہ میں ہو تو اپنے غصّہ کے زیرِ اثر باطل میں نہ جا پڑے اور جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے حق سے بے گانہ و برگشتہ نہ کردے اور جب اسے قدرت و اقتدار حاصل ہو تو وہ چیز نہ لے جس پر اس کا کوئی حق نہ پہنچتا ہو۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان ایک خاص طرح کے اخلاق و کردار کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ تینوں امور جن کا اس حدیث میں ذکر ہے درحقیقت ایمان کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہیں۔ ان کے بغیر ایمان اپنے اصل جوہر سے خالی ہی رہتا ہے۔

غصّہ آنے پر بالعموم لوگ فوراً انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے ان کو جائز و ناجائز کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ ایمانی اخلاق یہ ہے کہ انتہائی غصّہ و غضب کی حالت میں بھی آدمی کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو حق و انصاف کے خلاف ہو۔

خوشی اور فرحت کی حالت میں بھی عام طور پر آدمی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اس لیے خوشی ہو یا غم اس کے لیے کوئی ایسا انداز اختیار کرنا ہرگز زیبا نہیں ہے جو عدل اور حق کے منافی ہو۔

دنیا میں قدرت اور اقتدار پا کر بھی آدمی عام طور پر بھٹک جاتا ہے۔ اقتدار کا نشہ بہ آسانی اسے سرکش بنا دیتا ہے۔ جس چیز پر چاہتا ہے اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ قدرت اور اقتدار کسی کو اس لیے نہیں بخشا جاتا کہ وہ غاصب بن کر رہے۔ آدمی ہر حالت میں عدل وانصاف پر قائم رہے، ایمان حقیقت میں اسی چیز کا نام ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ایمان بے روح اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

صبر دشمن کے مقابلہ میں

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰیؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِیْ بَعْضِ اَیَّامِهِ الَّتِیْ لَقِیَ فِیْهَا الْعَدُوَّ، یَنْتَظِرُ حَتّٰی اِذَا مَالَتِ الشَّمْسُ قَامَ فِیْهِمْ فَقَالَ: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ الْعَافِیَةَ فَاِذَا لَقِیْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ ثُمَّ قَامَ النَّبِیُّ ﷺ وَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَ مُجْرِیَ السَّحَابِ وَ هَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْهِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ان ایام میں جن میں دشمن سے آپؐ کا سامنا پیش آیا تھا۔ آپؐ نے انتظار فرمایا یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپؐ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور خطاب فرمایا: ”اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی تمنا نہ کرو اور خدا سے عافیت کے طالب ہو۔ پھر جب ان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایے تلے ہے۔“ پھر نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا: ”اے اللہ! کتاب نازل فرمانے والے، بادل کو چلانے والے اور جتھوں کو بھگانے والے، انھیں بھگا دے اور ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“

تشریح: اسلام میں جنگ بہ ذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے کہ آدمی دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کی تمنائیں کرے۔ امن وعافیت بڑی نعمت ہے۔ اسے نعمت ہی تصوّر کرے اور خدا سے امن وعافیت کا طالب ہو۔ لیکن مومن اگر دشمنِ حق کو مٹانے اور اہل باطل کو زک دینے کے لیے مقابلے میں آجاتا

ہے تو پھر میدانِ جنگ سے فرار اختیار کرنا ایمان کے منافی ہے۔ ایسی صورت میں دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ دشمن کے مقابلے میں صبر وثبات سے کام لینا مومن کا شیوہ ہوتا ہے۔

صبر اطاعت میں

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهْوَاتِ وَ حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دوزخ کی آگ نفسانی مرغوبات سے ڈھانکی گئی ہے اور جنت ان چیزوں سے ڈھانکی گئی ہے جو نفس کو ناگوار ہوتی ہیں۔"

تشریح: یعنی شہوات ونفسانی خواہشات کی پیروی ہی انسان کو دوزخ میں لے جاتی ہے۔ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ کر انسان حق وباطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ پھر اسے حلال وحرام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا یہ طرزِ عمل اسے نارِ جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔

جنت خواہشاتِ نفس اور عیش وآرام کی قربانی مانگتی ہے۔ اس قربانی کے بغیر انسان کے اندر اعلیٰ کردار نشو ونما ہی نہیں پا سکتا۔ زندگی میں کتنے ہی ایسے مواقع آتے ہیں کہ خواہشات ہمیں ایسی چیزوں کی دعوت دیتی ہیں جو اخلاق وکردار کے لیے ہلاکت کی موجب ہوتی ہیں۔ اپنے اعلیٰ اخلاق وکردار ہی کی وجہ سے آدمی جنت کا حق دار ہوتا ہے۔

مسلم کی روایت میں حُجِبَتْ کے بجائے لفظ حُفَّتْ آیا ہے یعنی جنت کو ان چیزوں نے گھیر رکھا ہے جو نفس کو ناگوار ہوتی ہیں اور دوزخ کو ایسی چیزوں نے گھیر رکھا ہے جو نفس کو مرغوب وپسند ہوتی ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اللّٰه (علم خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ علم ہی ہم کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ جس طرح آدمی اور اس کی جنت کے درمیان مکارہ (مشقتوں اور تکلیفوں) کا حجاب ہے۔ جو مکارہ کو گوارا کرتا ہے یعنی خواہشاتِ نفس کی پرواہ کیے بغیر دُشواریوں اور مشقتوں کو انگیز کرتا ہے وہ جنت کو پالیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جو شخص علم میں در آتا ہے اسے خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔ خدا کی معرفت کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔